دردِ آشوب

آدم جی اُدبی انعام یافتہ مجموعۂ کلام

احمد فراز

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

خوشنویس : عشرت لکھنوی

طابع : شاہی پریس، لکھنؤ

قیمت : دس روپئے

ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و ادب، امین الدولہ پارک لکھنؤ

. . . . مجبوب اختر کے نام

ب :

غزلیں

اپنا لہو، تیری رعنائی، تاریکی اِس دُنیا کی

میں نے کیا کیا رنگ چُنے ہیں، دیکھوں کیا تصویر بنے

رنجش ہی سہی، دل ہی دُکھانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی، پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دُنیا ہی نبھانے کے لئے آ

کس کس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے، تو زمانے کے لئے آ

اِک عُمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لئے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لئے آ
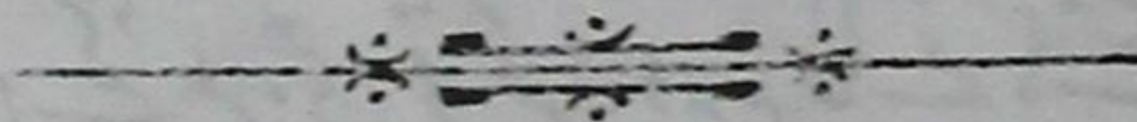
قربتوں میں بھی جُدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر، کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اَور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اَب یہی ترکِ تعلّق کے بہانے مانگے

میں وہ محروم، کہ جیسے کوئی ویرانہ ہو
تو وہ خوش فہم، خرابوں سے خزانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے، لُٹ بھی چکے
اور محبّت وہی انداز پُرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

جُز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پُرانے میرے

تو بھی خوشبو ہے، مگر میرا تجسّس بیکار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی، کہ وہ تو تھا، مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خَلق کی بے خبری ہے، کہ مری رُسوائی
لوگ مجھ کو ہی سُناتے ہیں فسانے میرے

لُٹ کے بھی خوش ہوں، کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اِک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

ق

کاش تو بھی مری آواز کہیں سُنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دُکھانے میرے

کاش اَوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری، آج خدا نے میرے

تو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گریوں تو بہت ہیں، مگر اے جانِ **فراز**
جُز ترے اَور کوئی زخم نہ جانے میرے
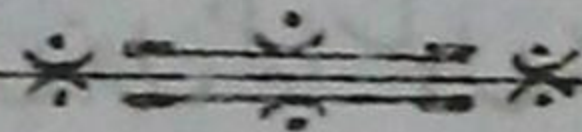
نہ حریفِ جاں، نہ شریکِ غم، شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم، دلِ بیقرار کوئی تو ہو

کسے زندگی ہے عزیز اب، کسے آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب، ترا اعتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گُل ملے، تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشان فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

یہ اُداس اُداس سے بام و در، یہ اُجاڑ اُجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں نہ سہی مگر، سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے، تو چراغِ دل ہی نہ بجھ چلے
وہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سرِ مقتلِ شبِ آرزو، رہے کچھ تو عشق کی آبرو
جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیب دار کوئی تو ہو

دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اُٹھا لے جائے

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈوبا ہوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیِ دل ہے، تو منزل معلوم!
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمہیں کون پکارے گا فراز
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

نہ انتظار کی لذّت، نہ آرزو کی تھکن
بُجھی ہیں درد کی شمعیں، کہ سو گیا ہے بدن

سُلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے، نہ رَت جگوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کے دار و رَسن

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سَرو سمن

بہارِ قرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں
جُدائیوں کی ہوائیں، محبّتوں کے چمن

وہ ایک رات گزر بھی گئی، مگر اَب تک
وصالِ یار کی لذّت سے ٹوٹتا ہے بدن

پھر آج شب ترے قدموں کی چاپ کے ہمراہ
سُنائی دی ہے دلِ نامُراد کی دھڑکن

یہ ظلم دیکھ، کہ تو جانِ شاعری ہے، مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جُرمِ سخن

امیرِ شہر غریبوں کو لُوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب، کبھی بنامِ وطن

ہَوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بُجھتا
مگر فراز سلامت ہے یار کا دامن
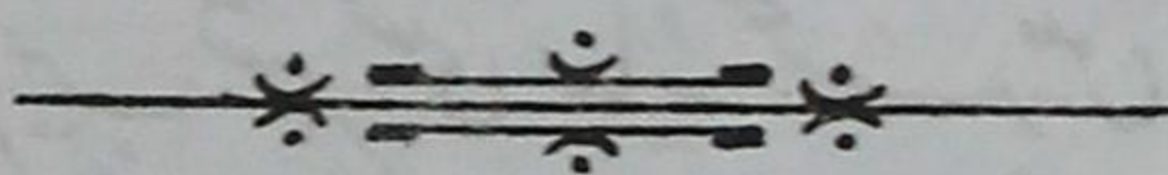
ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے
کیا خبر تھی، کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگیِ تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں، یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
میں ترے شہر سے دور، اور تو مرے دھیان میں ہے

سرِ دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
اے نسیمِ سحری! کچھ ترے امکان میں ہے

دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گاہے گاہے
جیسے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر کے ہر ظلم کے باوصف فراز
ہائے وہ ہاتھ، کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

خاموش ہو کیوں، دادِ جفا کیوں نہیں دیتے؟
بسمل ہو تو قاتل کو دُعا کیوں نہیں دیتے؟

وحشت کا سبب رَوزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بُجھا کیوں نہیں دیتے؟

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو، درد بڑھا کیوں نہیں دیتے؟

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے؟
مجرم ہیں اگر ہم، تو سزا کیوں نہیں دیتے؟

رَہزن ہو تو حاضر ہیں متاعِ دل و جاں بھی
رَہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے؟

کیا بیت گئی اب کے فرازؔ اہلِ چمن پر؟
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے؟

سُن بھی اے نغمہ سنجِ کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے
کون سا پیرہن سلامت ہے، دیجئے دعوتِ بہار کسے

جل بُجھیں دردِ ہجر کی شمعیں، گھُل چکے نیم سوختہ پیکر
سر میں سودائے خام ہو بھی تو کیا، طاقت و تابِ انتظار کسے

نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے، اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی، اس قدر پاسِ طبعِ یار کسے

کاہشِ ذوقِ جستجو معلوم، داغ ہے دل، چراغ ہیں آنکھیں
ماتمِ شہرِ آرزو کیجئے، فرصتِ نغمۂ قرار کسے

کون دارائے مُلکِ عشق ہوا، کس کو جاگیرِ چشم و زُلف ملی
"خونِ فرہاد برسرِ فرہاد" قصرِ شیریں پہ اختیار کسے

حاصلِ مشربِ مسیحائی، سنگِ تحقیر و مرگِ رُسوائی
قامتِ یار ہو کہ رفعتِ دار، ان صلیبوں کا اعتبار کسے

دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
اب تو ہم لوگ گئے دیدۂ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہو گی
میں، کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اُس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا
اور کچھ بھُول ہوئی ہے دلِ بے تاب سے بھی

اے سمندر کی ہَوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اُس حُسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فرازؔ
اَب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی

وفا کے باب میں الزام عاشقی نہ لیا
کہ تیری بات کی، اور تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ، کہ محرومِ التفات رہے
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمھارے بعد کئی ہاتھ دل کی سمت بڑھے
ہزار شکر، گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
کسی نے سنگ اٹھایا، کسی نے مینا لیا

بہ نامرادی منزل بھی مطمئن ہیں، کہ ہم
شکستہ پا تھے، مگر آسرا کوئی نہ لیا

فرازؔ ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری، چراغ بھی نہ لیا

ایسے چُپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جُدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بُھولنے والے، کہ تجھے
یاد کرنے کے لئے عُمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی، مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دُور بھی ہیں، منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے رُوئے ہیں، تو یوں خوش ہیں فراز
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

کیا ایسے کم سُخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سُکوت سے دل کو لہو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دُکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھائیے
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

تجھ کو بھلا کے دل ہے وہ شرمندۂ نظر
اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے

چُپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فرازؔ
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اُداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار، مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

علاج اِس دلِ دردآشنا کا کیا کیجئے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو، بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمھاری لگے

فرازؔ تیرے جنوں کا خیال ہے، ورنہ
یہ کیا ضرور، وہ صورت سبھی کو پیاری لگے
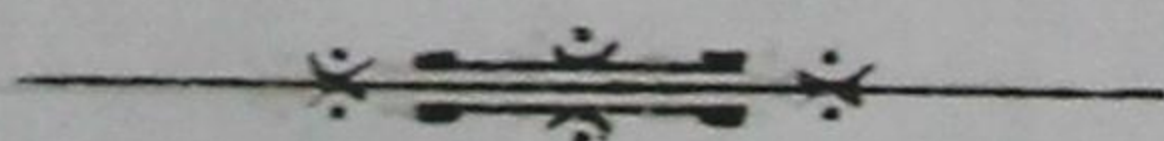
سَو دُوریوں پہ بھی مرے دل سے جُدا نہ تھی
تو میری زندگی تھی، مگر بیوفا نہ تھی

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

یوں دل لرز اُٹھا ہے کسی کو پُکار کر
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ تھی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وہ خاک تھا
اس جاں سپردگی کے تو قابل ہوا نہ تھی

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اُٹھی
اِس شہر کی فضا، کہ چراغ آشنا نہ تھی

مرہونِ آسماں جو رہے اُن کو دیکھ کر
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کوئی دُعا نہ تھی

ہر جسم داغ داغ تھا، لیکن فرازؔ ہم
بدنام یوں ہوئے، کہ بدن پر قبا نہ تھی

جو بھی دُکھ یاد نہ تھا، یاد آیا
آج کیا جانیئے کیا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے
پھر ترا عہدِ وفا یاد آیا

جس طرح دُھند میں لپٹے ہوئے پھُول
ایک اِک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبُوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی، تو کیا یاد آیا

اے رفیقو! سرِ منزل جا کر
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا؟

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد، کہ کیا یاد آیا

جب کوئی زخم بھرا، داغ بنا
جب کوئی بھول گیا، یاد آیا

یہ محبّت بھی ہے کیا روگ فرازؔ
جس کو بھولے، وہ سدا یاد آیا
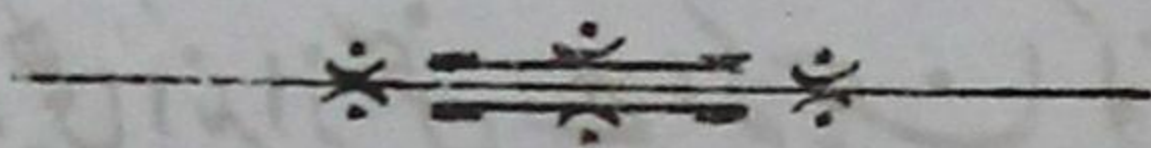
زخم کو پھول، تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے، کیا لوگ ہیں، کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لئے رک رک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے، تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی انداز سخن ہے، کہ جفا کو تیری
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجب ہے کہ ہم اہل تمنا کو فراز
وہ جو محروم تمنا ہیں، برا کہتے ہیں

گُل ہو چراغِ مے، تو سزاوارِ سنگ ہیں
مینا سرشت ہم بھی شہیدانِ رنگ ہیں

مُطرب کی بے دلی ہے، کہ محفل کی بے حسی
کس تیغ سے ہلاکِ نواہائے چنگ ہیں؟

دل خلوتِ خیال کی آرائشوں میں گُم
آنکھیں نگارخانۂ ہستی پہ دنگ ہیں

تاب و تواں نہیں ہے، مگر حوصلے تو دیکھ!
شیشہ صفت ہیں، پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

اے حُسنِ سادہ دل، تری رُسوائیاں نہ ہوں
کچھ لوگ کُشتۂ ہوسِ نام و ننگ ہیں

معذور ہیں، تلوّنِ خاطر کو کیا کریں
ہم خود فراز اپنی طبیعت سے تنگ ہیں

وہی جنوں ہے، وہی کوچۂ ملامت ہے
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدعا وہ گلِ تر، وہ سرو قامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی، مگر دلِ ناداں
نہ یاد کر، کہ اُسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلے یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے، مگر
یہ خامشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ، مگر پیرہن سلامت ہے

روز کی مسافت سے چُور ہو گئے دریا
پتھروں کے سینوں پر تھک کے سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصل لعل و گوہر کی
ریتیلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا

اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظارِ طوفاں میں خشک ہو گئے دریا

چاندنی میں آتی ہے کس کو ڈھونڈنے خوشبو
ساحلوں کے پھولوں کو کب سے رو گئے دریا

بجھ گئی ہیں قندیلیں، خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

دل چٹان کی صورت سیلِ غم پہ ہنستا ہے
جب نہ بن پڑا کچھ بھی، داغ دھو گئے دریا

زخمِ نامرادی سے ہم فرازؔ زندہ ہیں
دیکھنا سمندر میں غرق ہو گئے دریا

تو کہ انجان ہے، اس شہر کے آداب سمجھ
پھول روئے، تو اسے خندۂ شاداب سمجھ

کہیں آجائے میسر، تو مقدر تیرا
ورنہ آسودگیٔ دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
خشک آنکھوں کو مری چشمۂ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارۂ صد شوق نہ کہہ
ریگِ ساحل کو بھی لب تشنۂ سیلاب سمجھ

یہ بھی وا ہے کسی مانوس کرن کی خاطر
روزنِ در کو بھی اک دیدۂ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ اُمید سے تکتا ہے فراز
وہ جو اک کشتیٔ دل تھی اُسے غرقاب سمجھ

قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کو نہ رو، دوست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس مصر میں لائے ہو فراز
ذوقِ آشفتہ نوائی نہیں دیتا کچھ بھی

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اُسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صُبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گُل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اُس سے
وہ جو اک شخص ہے مُنہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دُنیا
آج تنہا ہوں، تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں، کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی، جو مری جاں میں گُھلا ہے اتنا
ہے وہی مجھ کو سَرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلّف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تونے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

غلط ہے جو سُنا، پر آزما کر
تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے

یہ محرومی نہیں، پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جُدا دیکھا نہ جائے

دل بھی بُجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مرجائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

آنکھوں کی سُرخ لہر ہے موجِ سپردگی
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

ہر حُسنِ سادہ لوح نہ دل میں اُتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

دُنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے بجُھے
بات اُس کی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی ہوں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رُسوائیاں بھی ہوں

جب تری یاد کے جگنو چمکے
دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے

سخت تاریک ہے دل کی دُنیا
ایسے عالم میں اگر تو چمکے

ہم نے دیکھا سرِ بازارِ وفا
کبھی موتی، کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدّتِ احساسِ جمال
رنگ تو رنگ ہے، خوشبو چمکے

آنکھ مجبورِ تماشا ہے فراز
ایک صورت ہے کہ ہر سو چمکے

پیام آئے ہیں اُس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بھُلا کے مجھے

جُدائیاں ہوں تو ایسی، کہ عمُر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالمَ
کہ لے اُڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا، مگر جہاں والے
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمھارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اُٹھا کے مجھے

کھنچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فراز دیکھ رہا ہے وہ مُسکرا کے مجھے
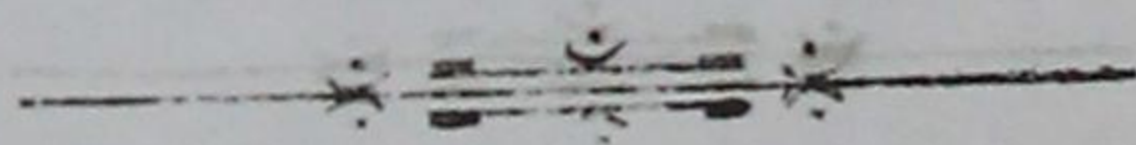
بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اَوروں کی طرح مجھ سے جُدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سنبھالوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پابستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

گرچہ اب قُرب کا امکاں ہے بہت کم، پھر بھی
کہیں مل جائیں تو تصویر نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے
دوسروں کے لئے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صِلہ
تم تو معصوم ہو، تم دُور ذرا ہو جانا

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجُاری کے خدا ہو جانا

دل میں اب طاقت کہاں خونابہ افشانی کرے
ورنہ غم وہ زہر ہے پتّھر کو بھی پانی کرے

عقل وہ ناصح، کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دل وہ دیوانہ، یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہریِ حالات کا
تجھ کو آزردہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اک شہرِ جنوں ہے چاک داما نو! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کِس کو کون زندانی کرے!

موسمِ گل ہے مگر بے رنگ ہے شاخِ مژہ
کتنا شرمندہ ہمیں آنکھوں کی ویرانی کرے

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے نہ سمجھے گا فراز
وہ تو سب کی بات سُن لے اور مَن مانی کرے

بے سروساماں تھے، لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
اس سے پہلے شہر کے لٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
خون رونے کی تمنّا کا یہ خمیازہ نہ تھا

آ مرے پہلو میں آ، اے رونقِ بزمِ خیال
لذّتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کون سا گل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اُس حُسن کے، لیکن فرازؔ
اتنا کہتے ہیں رہینِ سُرمہ و غازہ نہ تھا

تپتے صحراؤں پہ گرجا، سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو، مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اِک بوند
دل میں اِک لہر اُٹھی، آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب، کوئی ماہیٔ بے آب ہوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیسا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اُٹھانے والے!
چند بوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسا

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اُٹھا، یا برسا

ابر و باراں کے خدا، جھومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنّا برسا

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فراز
اور جہاں وہ ہیں، وہاں ابر کا سایا برسا

افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی
اے زہرِ غمِ یار بہت ہو چکی، بس بھی

یہ حبس تو جلتی ہوئی رُت سے بھی گراں ہے
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات مُعطّل ہے تو کچھ روز!
اے رندِ بلا نوش و تہی جام ترس بھی

صیّاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی، قفس بھی

محرومیٔ جاوید گنہگار نہ کر دے
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی

گھر میں کتنا سنّاٹا ہے، باہر کتنا شور
یا دُنیا دیوانی ہے، یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آ کر ناچ
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

یوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے
جیسے اس بستی کے سائے بھی ہوں آدم خور

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیا نادانی کی
اُس لمحے سے لیکر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرنا کس کو خوش آتا ہے فرازؔ
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں، دل پہ اگر ہو زور

اُب وہ جھونکے کہاں صَبا جیسے
آگ ہے شہر کی ہَوا جیسے

شب سُلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند، سُورج سے جل بجھا جیسے

مُدّتوں بعد بھی یہ عالم ہے
آج ہی تو جُدا ہُوا جیسے

اِس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دُوریٔ منزل
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فرازؔ
دوست ملتے نہیں ضیاؔ[1] جیسے

---

[1] ضیاء الدّین ضیاؔ

تو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں، انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی، ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

وہ دُور ہو، تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو، تو کب اختیار اپنا ہے

زمانے بھر کے دُکھوں کو لگا لیا دل سے
اِس آسرے پہ کہ اک غمگسار اپنا ہے

بُلا سے جاں کا زیاں ہو اِس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فراز راحتِ جاں بھی وہی ہے کیا کیجے
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
لاکھ سمجھایا کہ اُس محفل میں اب جانا نہیں

خود فریبی ہی سہی، کیا کیجیے دل کا علاج
تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں

ایک دُنیا منتظر ہے اَور تیری بزم میں
اِس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

جی میں جو آتی ہے کر گزرو، کہیں ایسا نہ ہو
کل پشیماں ہو، کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

زندگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہوگا فراز
اُس کا یہ کہنا، کہ تو شاعر ہے، دیوانہ نہیں

جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
بے دردہ ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اُس کوئے ستم میں
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اُترا بھی تو کب، درد کا چڑھتا ہوا دریا
جب کشتیٔ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
بے دَرد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اُس کوئے ستم میں
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اُترا بھی تو کب، دَرد کا چڑھتا ہوا دریا
جب کشتیِ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی
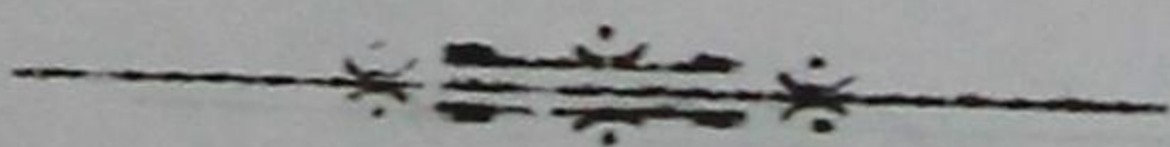
کسی کے تذکرے بستی میں کو بکو جو ہوئے
ہمیں خموش تھے، موضوعِ گفتگو جو ہوئے

نہ دل کا درد ہی کم ہے، نہ آنکھ ہی نم ہے
نہ جانے کون سے ارماں تھے وہ لہو جو ہوئے

نظر اُٹھائی تو گُم گشتۂ تحیّر تھے
ہم آئینے کی طرح تیرے روبرو جو ہوئے

ہمیں ہیں وعدۂ فردا پہ ٹالنے والے!
ہمیں نے بات بدل دی بہانہ جُو جو ہوئے

فراز ہو، کہ وہ فرہاد ہو، کہ ہو منصور
اُنھیں کا نام ہے، ناکامِ آرزو جو ہوئے

کروں نہ یاد، مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں، اور گنگناؤں اُسے

وہ خار خار ہے، شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں، پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں، اب کہاں سے لاؤں اُسے

مگر وہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے
کہ رُوٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دولتِ دل ہے، وہی جو راحتِ جاں
تمھاری بات پہ اے ناصحو، گنواؤں اُسے

جو ہمسفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے **فراز**
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اُسے

اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا
سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اِس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اِتنا نہ یاد آ، کہ تجھے بھول جائیں ہم

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لُٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فرازؔ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بھی رُلائیں ہم

اُتری تھی شہرِ گُل میں کوئی آتشیں کرن
وہ روشنی ہوئی، کہ سُلگنے لگے بدن

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر
شاخوں نے خود اُتار دیئے اپنے پیرہن

اِس انتہائے قرب نے دُھندلا دیا تجھے
کچھ دُور ہو، کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

میں بھی تو کھو چلا تھا زمانے کے شور میں
یہ اتفاق ہے، کہ وہ یاد آ گئے معاً

جس کے طفیل مُہر بلب ہم رہے فراز
اُس کے قصیدہ خواں ہیں سبھی اہلِ انجمن

کون آتا ہے، مگر آس لگائے رکھنا
عُمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پرسش پہ مُصر، اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اس نام نے مارا، کہ جہاں بھی جائیں
خلقتِ شہر نے طوفان اُٹھائے رکھنا

اس چکا چوند میں آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے
اس کے ہوتے ہوئے پلکوں کو جُھکائے رکھنا

میں کہ پُرشور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اب کہ ڈوبا ہوں تو سوکھے ہوئے دریاؤں میں

نامُرادی کا یہ عالم ہے، کہ اب یاد نہیں
تو بھی شامل تھا کبھی میری تمنّاؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اُس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

نظمیں

ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی

بہ سینہ رَہ سپرم دست و پا بُریدہ سہی

فن کاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دُنیا کے خوابوں کی جنّت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے انسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عمر بھر خوں اُگلتے رہے

جنگ کی آگ دُنیا میں جب بھی چلی
اَمن کی لوریاں تم سُناتے رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھُولی پھَلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیئے
تم نے دُنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیئے
تم مرے تو زمانے کے ہاتھوں سے وائے!
تم جیئے تو زمانے کی خاطر جیئے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدّعی
تم نے دُنیا سے دُنیا کی باتیں کہیں
تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے کوچۂ دار تک
کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

معبود

بہت حسین ہیں تیری عقیدتوں کے گلاب
حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیال ترا
ہم ایک درد کے رشتے میں منسلک دونوں
تجھے عزیز مرا فن، مجھے جمال ترا

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اُگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے، اذیّت ہے زندگی بھر کی
یہاں گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
یہاں قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اُس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں، کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھُول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صُبح ہوتے ہی
وُفا پرست صلیبوں پہ جھُول جاتے ہیں

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند
کب سے شاخِ نہالِ غم پر

لرز رہا ہوں

مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت
کہ جب بہاروں کی آخری شام
مجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اب عُمر بھر نہ دیکھے گا

ہم ہیں اک دوسرے کو کوئی

وہ رات کتنی کڑی تھی

جب آندھیوں کے شب خوں سے

بُوئے گُل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑیوں خشک و زرد رُو تھے

کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہوئے رفیقوں کی

زخم خوردہ برہنہ لاشیں

گڑی ہوئی ہوں

میں جانتا تھا

کہ جب یہ بوجھل بلند اشجار

جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں

ہجومِ صَرصَر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو

میں ایک برگِ خزاں بھی

شاخِ نہالِ غم پر نہ رہ سکوں گا

وہ ایک پل تھا کہ ایک رُت تھی
مگر مرے واسطے بہت تھی
مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اوّلیں صبح
پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو
زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی
مگر مرا دل دھڑک رہا ہے
مجھے، جسے آندھیوں کی یورش
خزاں کے طوفاں نہ چھو سکے تھے
کہیں نسیمِ بہار —— شاخِ نہالِ غم سے
جدا نہ کر دے

خُود کلامی

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رُخسار وہ گیسو
بس ایک کھنکتی ہوئی آواز کا جادُو
حیران و پریشان لئے پھرتا ہے بہ ہر سُو

پابندِ تصوّر نہیں وہ جلوۂ بیتاب
ہو دُور تو جُگنو ہے، قریب آئے تو خوشبو
لہرائے تو شعلہ ہے، چھنک جائے تو گھنگرو

باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر

وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کُوکُو
جیسے کوئی قمری سرِ شمشاد لبِ جُو

اے دل تری باتوں پہ کہاں تک کوئی جائے

جذبات کی دُنیا میں کہاں سوچ کے پہلو
کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہُو

مانا کہ وہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خُو
شاید کہ وہ عارض ہوں گُلِ تر سے بھی خوشرو
دلکش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرُو

پر کس کو خبر کس کا مقدّر ہے یہ سب کچھ

خوابوں کی گھٹا دُور برس جائے گی، اور تو
لَوٹ آئے گا لیکر فقط آہیں، فقط آنسُو

اظہار

پتھر کی طرح اگر میں چپ ہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھ کو
اے سنگ تراش! تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اوّلیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لئے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے

خودکشی

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو

ہم سمجھے تھے پایندہ

وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو

برسوں رکھا تابندہ

دونوں وفا کر کے ناخوش ہیں

دونوں کئے پر شرمندہ

پیار سے پیارا جیون پیارے

کیا ماضی، کیا آیندہ

ہم دونوں اپنے قاتل ہیں

ہم دونوں ابتک زندہ

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر!
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اُس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سُنی اور چاہا
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے
لیکن اس عجز سے ہارا مرے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

زیرِ لب

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

آغازِ سفر میں جب چلے تھے
کب ہم نے کوئی دِیا جلایا

کب عہدِ وفا کی بات کی تھی

کب ہم نے کوئی فریب کھایا

وہ شام وہ چاندنی وہ خوشبو

منزل کا کِسے خیال آیا

تو محوِ سُخن تھی مجھ سے، لیکن

میں سوچ کے جال بُن رہا تھا

میرے لئے زندگی تڑپ تھی

تیرے لئے غم بھی قہقہہ تھا

اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں

کچھ تو نے کہا تھا! کیا کہا تھا

ہمدرد

اے دل اُن آنکھوں پہ نہ جا

جن میں وفورِ رنج سے

کچھ دیر کو تیرے لئے

آنسو اگر لہرا گئے

یہ چند لمحوں کی چمک

جو تجھ کو پاگل کر گئی

ان جگنوؤں کے نور سے

چمکی ہے کب وہ زندگی

جس کے مقدّر میں رہی

صُبحِ طلب سے تیرگی

کِس سوچ میں گم سُم ہے تو

اے بے خبر! ناداں نہ بن

تیری فسردہ رُوح کو

چاہت کے کانٹوں کی طلب

اور اُس کے دامن میں فقط

ہمدردیوں کے پھُول ہیں

خواب

وہ چاند جو میرا ہمسفر تھا
دُوری کے اُجاڑ جنگلوں میں
اَب میری نظر سے چھپ چکا ہے

اِک عُمر سے ہیں ملُول و تنہا
ظلمات کی رہگذار میں ہوں
مَیں آگے بڑھوں، کہ لَوٹ جاؤں
کیا سوچ کے انتظار میں ہوں
کوئی بھی نہیں، جو یہ بتائے
میں کون ہوں؟ کس دیار میں ہوں

سوال

(فراقؔ کی تصویر دیکھ کر)

اک سنگ تراش جس نے برسوں

ہیروں کی طرح صنم تراشے

آج اپنے صنم کدے میں تنہا

مجبور، نڈھال، زخم خوردہ

دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُجاڑ زندگی کے

لمحات کی اَن گنت خراشیں

آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
رُوٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن، بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہُو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت، کہ بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھُو لے

یہ زخمِ طلب، یہ نامُرادی
ہر بُت کے لبوں پہ ہے تبسّم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے، کہ خالق
انسان جو اب چاہتا ہے

غریبِ شہر کے نام

غریبِ شہر تری دُکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب، تری چاہت، تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنّائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد، سکوتِ سخن ادا پہ سلام

دریدہ دل! ترے آہنگِ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ نم پہ نثار

جنوں کا شہر ہے آباد، فصلِ دار کی خیر
ہر ایک دل ہے گریباں، بھری بہار کی خیر
بجھے ہیں بام، مگر شمعِ رہگذار کی خیر
تمام عمر جو گزرے، اس انتظار کی خیر

رُخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں ہے، اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدۂ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے رات سے پہلے

ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی
بہ سینہ رہ سپرم دست و پا بریدہ سہی

پیغامبر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دُکھ کی تاریکی لئے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انباروں کو کاندھوں پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مُو، افسردہ رُو، خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلّم، پر سراپا التماس
اس تمنّا پر کہ تم کو مل سکے
غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن — جینے کی آس

میں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
میں نہیں جوہر شناس

صورتِ انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دل میں قہقہوں کے چور
لیکن آنکھ سے آنسو رواں
سب کے سینوں میں اُمیدوں کے چراغاں
اور چہروں پر شکستوں کا دُھواں
زندگی سب سے گُریزاں
سُوئے مقتل سب رواں
سب نحیف و ناتواں
سب کے سب اک دوسرے کے ہمسفر
اک دوسرے سے بدگماں
سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس

میری باتوں سے میری آواز سے

تم نے یہ جانا کہ میں بھی

لے کے آیا ہوں تمہارے واسطے وہ معجزے

جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمہارے

اَن گِنت صدیوں کے لاتعداد زخم

دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم

منتظر ہیں قُم بِاِذنی کی صدائے سحر کے

ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں

اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں —— تیرہ جبیں

مَن وسلویٰ کے لئے دامن کشا

قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں

صِرف تقدیر و توکّل پر یقیں

تم کو شیرینِ طرب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سِل کو

چھیڑنے کا حوصلہ، یارا نہیں

تم یدِ بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں

تم کہ ہو کوہِ گرفتہ ــــــ زندگی سے دُور

مُردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں

خاکداں کی اس گلِ تاریک کا

میں بھی اِک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم

سایۂ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمھارا جزوِ دیں

سات قلزم موجزن چاروں طرف

اور تمھارے بخت میں شبنم نہیں

اپنے اپنے دُکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو

تم نے کھولا ہے کبھی

اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی

سب کی رُوحیں گرسنہ ـــــــ سب کی متاعِ درد ہیں

دوسروں کا خون پینے کی ہوس

ایک کا دُکھ دوسرے سے کم نہیں

ایک کا دُکھ تشنگی ـــــــ بیچارگی

دوسرے کا دُکھ مگر افراط ہے ـــــــ دیوانگی

پیاس اور نشے کا دُکھ

اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو

پیاس اور نشے کا دُکھ اک دوسرے میں بانٹ لو

پھر تمھاری زندگی شاید نہ ہو

شاکیِ عرشِ بریں و رحمۃ اللعالمینؐ

بس کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

خدائے برتر

خدائے برتر!

مری محبّت

تری محبّت کی رفعتوں سے عظیم تر ہے

تری محبّت کا درخورِ اعتنا

فقط بیکراں سمندر

کہ جس کی خاطر

سُدا تری رحمتوں کے بادل

کبھی کسی آبشار کی نغمگی کے موتی

کبھی کسی آبجُو کے آنسو

کبھی کسی جھیل کے ستارے

کہیں سے شبنم کہیں سے چشمے کہیں سے دریا اُڑا کے لائے

کہ تیرے محبوب کو جلال و جمال بخشیں

تری محبّت تو اُس شہنشاہ کی طرح ہے

جو دوسروں کے ہنر سے، خونِ جگر سے

اپنی وفا کو نقشِ دوام بخشے

مگر مری بے بساط چاہت

فقط مرے آنسوؤں سے

میرے لہو سے ——— میری ہی آبرو سے

رہی ہے زندہ

اگرچہ اس بے بضاعتی نے

مجھے ہمیشہ شکست دی ہے

مگر یہ ناکامیِ تمنّا بھی

اِس محبّت سے کامراں تر عظیم تر ہے

جو اپنی سطوت کے بَل پر

اَوروں کی آہ وزاری سے

اپنے جذب و وفا کی تشہیر چاہتی ہے

مری محبّت نے

جو بھی نام حبیب سے کر دیا معنون

وہ حرف میرا ہے، میرا اپنا ہے

اے خدائے بزرگ و برتر

خود غرض

اے دل! اپنے درد کے کارن تو کیا کیا بیتاب رہا
دن کے ہنگاموں میں ڈوبا، راتوں کو بے خواب رہا
لیکن تیرے زخم کا مرہم تیرے لئے نایاب رہا

پھر ایک انجانی صورت نے تیرے دکھ کے گیت سنے
اپنی سندرتا کی کرنوں سے چاہت کے خواب بنے
خود کانٹوں کی باڑھ سے گزری تیری راہ میں پھول چنے

اے دل! جس نے تیری محرومی کے داغ کو دھویا تھا
آج اس کی آنکھیں پرنم تھیں اور تو سوچ میں کھویا تھا
دیکھ پرائے دکھ کی خاطر تو بھی کبھی یوں رویا تھا!

وابستگی
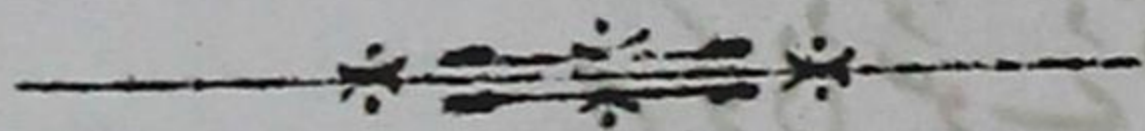
آ گئی پھر وہی پہاڑ سی رات
دوش پر ہجر کی صلیب لئے
ہر ستارہ ہلاکِ صبح طلب
منزلِ خواہشِ حبیب لئے

اس سے پہلے بھی شام وصل کے بعد
کاروانِ دل و نگاہ چلا
اپنی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے
ہر کوئی سوئے قتل گاہ چلا

کتنی باہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے
کتنی آنکھوں سے چھن گئے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

پھر بھی ویراں نہیں ہے کوئے مُراد
پھر بھی ہے رسم عاشقی زندہ
پھر بھی روشن ہے بزم رسم وفا
پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے
ہر مسیحا کو دار کرتے ہیں
پھر اُسی کی مراجعت کے لئے
حشر تک انتظار کرتے ہیں

مَمدُوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکُل ولب کی تعریف
میں نے کب لکھّے قصیدے ترے رخساروں کے
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں
میں نے کب شعر کہے جُھومتے گلزاروں کے
جانے دو دِن کی محبت میں یہ بہکے ہوئے لوگ
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے

میں کہ شاعر تھا، مرے فن کی روایت تھی یہی

مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں

مسکراتی ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں

ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں

میری فطرت تھی، کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر

ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رخِ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول

ایسی چاہت، کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے

گر مجھے ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ

تو ہے وہ شمع، کہ پتھر کی بھی پروا نہ کرے

میں نہیں کہتا، کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی

ورنہ شوریدگیِ شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے، کہ ترے حُسن کی رعنائی سے

میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں، کہ مہتاب

تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی

وہ دل آویز صداقت، کہ کئی خواب

تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک

میرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا

میرے دُکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے

میرے پیکر میں تری ذات گُھلی ہے اتنی

کہ مرا جسم مری رُوح نہیں تیرے

میرا موضوعِ سُخن تو ہو، کہ ساری دُنیا

درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

اے نگارِ گُل

نگارِ گُل تجھے وہ دن بھی یاد ہوں شاید
کہ جن کے ذکر سے اب دل پہ تازیانہ لگے
تری طلب میں وہ دار و رسن کے ہنگامے
کہ جن کی بات کریں بھی تو اب فسانہ لگے

بقدرِ ذوق جلاتے رہے لہو کے چراغ

کہ تو جب آئے تو یہ گھر نگار خانہ لگے

اسی خیال سے ہر زخم اپنے دل پہ سہا

کہ تجھ کو گردشِ ایّام کی ہوا نہ لگے

مگر جو گزری ہے ہم پر ترے حصول کے بعد

وہ حالِ غم بھی کہیں، گر تجھے بُرا نہ لگے

نگارِ گل وہ ہمیں تھے ترے تمنّائی

کہ جن کے خوں سے ترے رنگ تابناک ہوئے

ہمیں ہیں جن سے قبا تیری لالہ رنگ ہوئی

ہمیں ہیں وہ جو تری رہگزر میں خاک ہوئے

خزاں تو خیر ستم کیشیوں کی رُت تھی، مگر

بہار میں بھی ہمارے جگر ہی چاک ہوئے

ہمیں منارۂ کسریٰ کو توڑنے والے

ترے حریم میں آ کر ہمیں ہلاک ہوئے

نگارِ گُل یہ تقاضہ مگر وفا کا ہے

کہ اب بھی ہم ترے وعدوں کا اعتبار کریں

گزر گئی جو گزرنی تھی سخت جانوں پر

پھر آج تیری جفاؤں کا کیا شمار کریں

اَلم گزیدہ سہی، پیرہن دَریدہ سہی!

مگر لبوں پہ غمِ دل نہ آشکار کریں

یہی اصول رہا ہے وفا پرستوں کا

ہر ایک حال میں توصیفِ حُسنِ یار کریں

جبیں سے دھو کے ہر اک نقش نامُرادی کا

نگارِ گُل ترے جلوؤں کا انتظار کریں
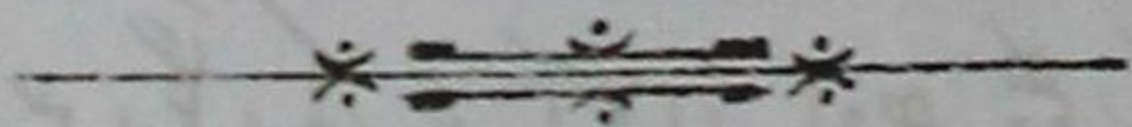
گُل شُدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو!

عُمر گزُری ہے سجاتے ہوئے بام و در کو

اِس تمنّا پہ، کہ وہ جانِ بہار آئے گی

فرشِ رہ دیدہ و دل تھے کہ وہ آسودہ خرام

درد کی آگ کو گلزار بنا جائے گی

اِس توقّع پہ خرابے رہے آغوش کُشا

کُھل کے برسے گی اگر اُبکے گھٹا چھائے گی

ایک اک لمحہ قیامت کی طرح گزرا ہے

آخرِ کار وہ محبوب نظر بھی آئی

منتظر آنکھیں تو پتھرا ہی چکی تھیں، لیکن

کشتگانِ شبِ فرقت کی سحر بھی آئی

جسم کیوں شل ہیں، دھڑکتے ہوئے دل کیوں چُپ ہیں

جرَسِ گُل کی تو آواز ادھر بھی آئی

آج پھر کرتے ہو کس زعم پہ زخموں کا شمار

سر پھرو! وادیِ پُر خار میں یہ تو ہوگا

کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دھواں

آرزوئے لب و رُخسار میں یہ تو ہوگا

ایک سے ایک کڑی منزلِ جاں آئے گی

رہگذارِ طلبِ یار میں یہ تو ہوگا!

ہونٹ سِل جائیں، مگر جرأتِ اظہار رہے

دل کی آواز کو مدّھم نہ کرو دیوانو!

ڈھل چکی رات تو اب کُہر بھی چھٹ جائے گی

اب بھی اُمّید کی لَو کم نہ کرو دیوانو!

آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک حبس کے بعد

گُل شُدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو!

اے مرے بیدرد شہر

دل سُلگ اُٹھتا ہے اپنے بام و دَر کو دیکھ کر
پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں
اِس قدر ویران لمحے، اِس قدر سُنسان رُت
سوچ میں گم ہیں اُفق سے تا اُفق پہنائیاں
کِس لئے رُوشن کروں دیوار و دَر، کوئی تو ہو
گُنگ دیواروں میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

دُور ہر شب جاگ اُٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم
آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں
راستوں سے خوابگاہوں تک مسلسل مَوجِ رنگ
جس طرح قوسِ قُزح کی ٹوٹتی انگڑائیاں
زخمِ نظّارہ لئے آنکھوں میں چُپ تکتا رہا
گو مری نیندیں بھی مجھ سے لے اُڑیں شہنائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در
جھلملا اُٹھی تھیں میری رُوح کی گہرائیاں
چند لمحوں کے لئے لَو دے اُٹھا تھا اِک چراغ
اور دمک اُٹھی تھیں کچھ لمحے مری تنہائیاں
آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بیدرد شہر
ہر نظر میری طرف ہے، اِس قدر رُسوائیاں ؟

تِریاق

جب تیری اُداس انکھڑیوں میں
پَل بھر کو چمک اُٹھے تھے آنسو
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دِل پر
جب میرے لئے ملول تھی تو

کہنے کو وہ زندگی کا لمحہ
پیمانِ وفا سے کم نہیں تھا

ماضی کی طویل تلخیوں کا
جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا
تو! میرے لئے! اُداس! اتنی
کیا تھا، یہ اگر کرم نہیں تھا

تو آج بھی میرے سامنے ہے
آنکھوں میں اُداسیاں نہ آنسو
اِک طنز ہے تیری ہر اَدا میں
چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو
یا اَب مرے زخم بھر چکے ہیں
یا سب مرا زہر پی چکی تو

مجھ سے پہلے

مجھ سے پہلے تجھے جس شخص نے چاہا، اُس نے

شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو

ایک بے نام سی اُمّید پہ اب بھی شاید

اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو

میں نے مانا، کہ وہ بیگانۂ پیمانِ وفا!
کھو چکا ہے جو کبھی اور کی رعنائی میں
شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دُکھ نہ رُلائے تجھے تنہائی میں

میں نے مانا، کہ شب و روز کے ہنگاموں میں
وقت ہر غم کو بھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ
چاہے اُمّید کی شمعیں ہوں، کہ یادوں کے چراغ
مُستقل بُعد بجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ

پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے
مُدّتیں درد کی لَو کم تو نہیں کر سکتیں
زخم بھر جائیں، مگر داغ تو رہ جاتا ہے
دُوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وہ پشیماں ہو کر

تیرے پاس آئے، زمانے سے کنارا کر لے

تو، کہ معصوم بھی ہے، زود فراموش بھی ہے

اُس کی پیماں شکنی کو بھی گوارا کر لے

اور میں، جس نے تجھے اپنا مسیحا سمجھا

ایک زخم اَور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں

جس پہ پہلے بھی کئی عہدِ وفا ٹوٹے ہیں

اسی دوراہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں

* * *
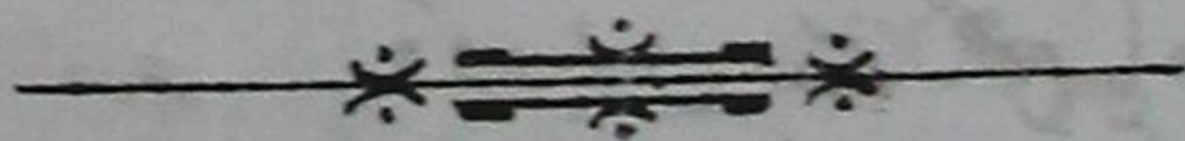
کوئی بھٹکتا بادل

دُور اِک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہوئی بستی کی طرف آئے گا
کتنی حسرت سے اُسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وہ وقت کی مانند گزُر جائے گا

جانے کس سوچ میں کھو جائیگی دل کی دُنیا
جانے کیا کیا مجھے بیتا ہوا یاد آئے گا
اور اس شہر کا۔ بے فیض بھٹکتا بادل
درد کی آگ کو پھیلا کے چلا جائے گا
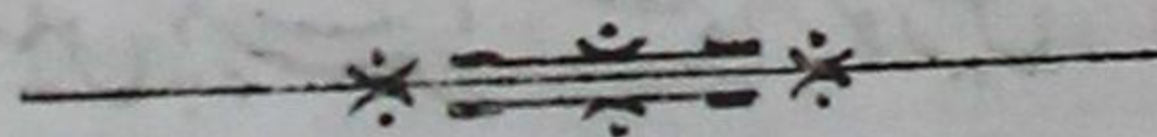
زندگی! اے زندگی

میں بھی چُپ ہو جاؤں گا بُجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ

اور کچھ لمحے ٹھہر، اے زندگی! اے زندگی

جب تلک روشن ہیں آنکھوں کے فسردہ طاقچے

نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی صدا کی روشنی

جسم کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامے ہوئے

موم کے بُت، آتشیں چہرے، سُلگتی مورتیں

میری بینائی کی یہ مخلوق زندہ ہے ابھی

اور کچھ لمحے ٹھہر، اے زندگی! اے زندگی

ہو تو جانے دے مرے لفظوں کو معنی سے تہی

میری تحریریں، دھوئیں کی رینگتی پرچھائیاں

جن کے پیکر اپنی آوازوں سے خالی، بے لہو

محو ہو جانے تو دے یادوں سے خوابوں کی طرح

رک تو جائیں آخری سانسوں کی وحشی آندھیاں

پھر ہٹا لینا مرے ماتھے سے تو بھی اپنا ہاتھ

میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ

اور کچھ لمحے ٹھہر، اے زندگی! اے زندگی

یہ تو جب ممکن ہے......

پھر چلے آئے ہیں ہمدم لیکے ہمدردی کے دام
آہوئے رم خوردہ کی وحشت بڑھانے کیلئے
میرے دل سے تیری چاہت کو مٹانے کیلئے

چھیڑ کر افسانۂ ناکامیِ اہلِ وفا!
تیری مجبوری کے قصّے، میری بربادی کی بات
اپنی اپنی سرگزشتیں، دوسروں کے تجربات

ان کو کیا معلوم، لیکن تیری چاہت کے کرم
میری تنہائی کے دوزخ، میری جنّت کے بھرم
تیری آنکھوں کا وفا آمیز افسردہ جمال

کاش! اتنا سوچ سکتے غمگساروں کے دماغ
یہ تو جب ممکن ہے بجھ جائے ہر آنسو ہر چراغ
خود کو ان میں دفن کردوں، بھول جاؤں اپنا نام
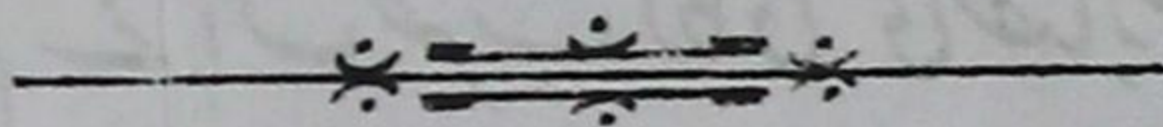
شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے نام

تم نے جس دن کے لئے اپنے جگر چاک کئے

سو برس بعد سہی، دن تو وہ آیا آخر

تم نے جس دشتِ تمنّا کو لہو سے سینچا

ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر

نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ

ایک اک بوند نے طوفان اُٹھایا آخر

تم نے اِک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر

ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے، جو

ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے

زلفِ آزادی کے ہر تار سے دستِ ایّام

حرّیت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے

تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدّس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لئے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے، زندہ گڑے، پھر بھی بڑھے
وادیِ مرگ بھی منزل گہِ اُمّید بنی
ہاتھ کٹتے رہے، پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی، باعثِ تقلید بنی
شب کے سفّاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

پیمبرِ مشرق

وہ شب، کہ جس میں ترا شعلۂ نوا لپکا
ڈھلی تو ماتمِ یک شہرِ آرزو بھی ہوا
وہ رُت، کہ جس میں ترا نغمۂ جنوں گونجا
کٹی تو سازِ تمنّا لہو لہو بھی ہوا

یہی بہت تھا کوئی منزلِ طلب تو ملی
کہیں تو مژدۂ قُربِ حریمِ یار ملا
ہزار شُکر، کہ طعنِ برہنگی تو گیا
اگرچہ پیرہنِ شوق تار تار ملا

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے
رہے گا پیشِ نظر تیرا آئینہ جس میں
ہم اپنے ماضی و فردا کا حال دیکھیں گے

مگر جو حال طلوعِ سحر کے بعد ہوا
جو تیرے درس کی تحقیر ہم نے دیکھی ہے
بیاں کریں بھی تو کس سے کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے

مُدبّروں نے وفا کے چراغ گُل کر کے
درازدستیِ جاہ و حشم کو عام کیا
مفکّروں نے فقیہوں کی دلدہی کیلئے
خودی کی مے میں تصوّف کا زہر گھول دیا

وہ کم نظر تھے کہ نادان تھے کہ شعبدہ گر
جو تجھ کو جنّ و ملائک کا ترجماں سمجھے
تری نظر میں ہمیشہ زمیں کے زخم رہے
مگر یہ تجھ کو مسیحائے آسماں سمجھے

عروجِ عظمتِ آدم تھا مُدّعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ وفا اُبھارتے ہیں
کِس آسماں پہ ہے تو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم تجھے آج بھی پکارتے ہیں

المیہ
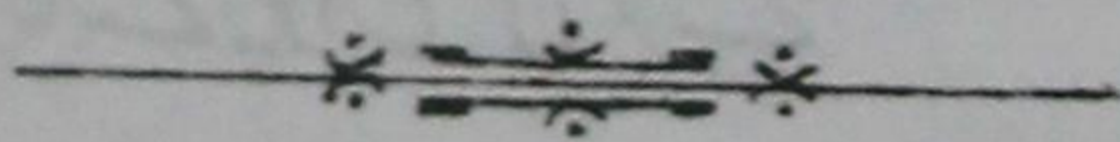
کِس تمنّا سے یہ چاہا تھا کہ اک روز تجھے
ساتھ اپنے لئے اُس شہر کو جاؤں گا، جسے
مجھ کو چھوڑے ہوئے بھولے ہوئے اِک عُمر ہوئی

ہائے وہ شہر، کہ جو میرا وطن ہے، پھر بھی
اُس کی مانوس فضاؤں سے رہا بیگانہ
میرا دل ـــــ میرے خیالوں کی طرح دیوانہ

آج حالات کا یہ طنزِ جگر سوز تو دیکھ!
تو مرے شہر کے اک حجلۂ زرّیں میں مکیں
اور میں پردیس میں جاں دادۂ یک نانِ جویں

مِلکیت

سسکیاں لینے سے کیا فائدہ اے زینتِ شب

دیکھ اس ہنستی ہوئی رات کو افسردہ ن

تیرا رونا تجھے تسکین تو دے سکتا ہے

لیکن اِس انجمن عیش کو آزردہ

مجھ پہ روشن ہے ترے سوئے ہوئے درد کی آگ
جبر کی بادہ گساری سے بھڑک اُٹھی ہے
تیری کچلی ہوئی غیرت، تری روندی ہوئی روح
اِک حقارت بھری ٹھوکر سے بھڑک اُٹھی ہے

اور یہ توہین ترے جسم کی توہین نہ تھی
ورنہ یہ زہر تو ہنس ہنس کے پیا ہے تو نے
وقفِ گردش رہی ساغر کی طرح دست بدست
بزم کی بزم کو سرشار کیا ہے تو نے

تو نے ہر جلتی ہوئی روح کو گلزار کیا
تو ہر اک ہاتھ میں غنچے کی طرح چٹکی ہے
تو نے ہر دوش پہ بکھرائی ہیں اپنی زلفیں
تو ہر آغوش میں خوشبو کی طرح بھٹکی ہے

مگر امشب ترے احساس پہ وہ چوٹ پڑی

تلخ فاقوں کی اذیّت بھی بھلا دی جس نے

تیرے کردار کے صحرا سے وہ آندھی اُٹھی

فکرِ فردا کی بھی دیوار گرا دی جس نے

تجھ کو معلوم نہیں ہے مگر اے دشمنِ جاں

اس تجارت سے عبادت تری شخصیّت ہے

جسم سے لیکے تری رُوح تلک آج کی رات

یا مری، یا مرے احباب کی ملکیّت ہے

محرُوم

اِس گھر کی دیواریں چُپ ہیں
اِس دَر کے خاموش دِیے

سانسیں روکے پیڑ کھڑے ہیں
جیسے مُجرم ہونٹ سِیے

جب بھی ہوا کا کوئی جھونکا
آئے ترا پیغام لیے

یوں خواہش رو دیتی ہے
جیسے کوئی بے وجہ جیے

جیسے عُمریں بیت گئی ہوں
اپنے آپ کو یاد کیے

جیسے صدیوں سے دُنیا ہو
تنہائی کا زہر پیے

تمثیل

کتنی صدیوں کے انتظار کے بعد
قربتِ یک نفس نصیب ہوئی
پھر بھی تو چُپ، اُداس، کم آمیز

اے سُلگتے ہوئے چراغ بھڑک
درد کی روشنی کو چاند بنا
کہ ابھی آندھیوں کا شور ہے تیز

ایک پل مرگِ جاوداں کا صِلہ
اجنبیت کے زہر میں مت گھول
مجھ کو مت دیکھ، لیکن آنکھ تو کھول

نیند
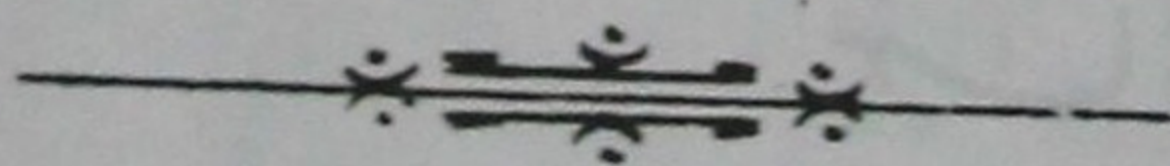
سرد پلکوں کی صلیبوں سے اُتارے ہوئے خواب
ریزہ ریزہ ہیں مرے سامنے شیشوں کی طرح
جن کے ٹکڑوں کی چبھن، جن کی خراشوں کی جلن
عمر بھر جاگتے رہنے کی سزا دیتی ہے
شدّتِ کرب سے دیوانہ بنا دیتی ہے

آج اِس قرب کے ہنگام وہ احساس کہاں
دل ہیں وہ درد، نہ آنکھوں میں چراغوں کا دھواں
اور صلیبوں سے اُتارے ہوئے خوابوں کی مثال
جسم گرتی ہوئی دیوار کی مانند نڈھال
تو مرے پاس سہی، اے مرے آزردہ جمال

خوشبو کا سفر

چھوڑ پیمانِ وفا کی بات، شرمندہ نہ کر
دوریاں، مجبوریاں، رسوائیاں، تنہائیاں
کوئی قاتل، کوئی بسمل، سسکیاں، شہنائیاں
دیکھ! یہ ہنستا ہوا موسم ہے موضوعِ نظر

وقت کی رَو میں ابھی ساحل، ابھی موجِ فنا
ایک جھونکا، ایک آندھی، اِک کرن، اِک جوئے خوں
پھر وہی صحرا کا سنّاٹا، وہی مرگِ جنوں
ہاتھ ہاتھوں کا اُثاثہ، ہاتھ ہاتھوں سے جُدا

جب کبھی آئے گا ہم پر بھی جُدائی کا سَماں
ٹوٹ جائے گا مرے دل میں کسی خواہش کا تیر
بھیگ جائے گی تری آنکھوں میں کاجل کی لکیر
اور پیمانِ وَفا۔ جیسے اَندھیروں میں دُھواں

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ! یہ ہنستا ہوا موسم، یہ خوشبو کا سَفر
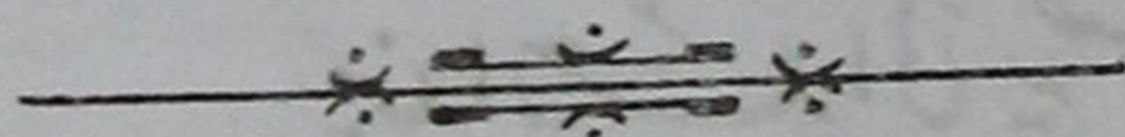
اَب کے بَرَس بھی

لَب تشنہ و نو مید ہیں ہم اَب کے بَرَس بھی

اے ٹھہرے ہوئے اَبرِ کرم اَب کے بَرَس بھی

کچھ بھی ہو گلستاں میں، مگر کُنجِ چمن سے

ہیں دُور بہاروں کے قدم اَب کے بَرَس بھی

اے شیخِ خرم دیکھ! کہ باوصفِ چراغاں

تیرہ ہیں دَر و بامِ حرم اَب کے بَرَس بھی

اے دل زدگاں! خیر مناؤ، کہ ہیں نازاں

پندارِ خدائی پہ صنم اَب کے بَرَس بھی

(ق)

پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریِ ایّام

ہیں کشتۂ غم، کشتۂ غم اب کے برس بھی

لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسّم

ہو گا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی

ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں

روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی

پہلے کی طرح ہوں گے تہی جامِ سفالیں

چھلکے گا ہر اک ساغرِ جم اب کے برس بھی

مقتل میں نظر آئیں گے پابستۂ زنجیر

اہلِ نظر و اہلِ قلم اب کے برس بھی

... اَن دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہو گا ترازوِ ہجر کے ترکش کا تیر
مختلف ہوں گے تو کتنے دوسرے لوگوں سے ہم
جو چلے تھے کوچۂ جاناں سے مقتل کی طرف
بے نیازِ سنگِ خلقت، بے غمِ تیغِ ستم
اپنے اپنے شوقِ بے پروا کی باراتیں لئے
دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلائے ہر قدم
ان میں ہر اک باوفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

ان کی آنکھیں ریزہ ریزہ، ان کی جانیں زخم زخم
ان کے آنسو کانچ کے تابوت، ریشم کے کفن

ان میں خوابیدہ کسی لیلےٰ، کبھی شیریں کا خواب
ان میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہکن
ان کے ماتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو
ان کے ہاتھوں کی لکیروں میں جواں مرگوں کا فن
ان میں ہر اک تھا کسی دامِ تمنّا کا اسیر

ان پہ جو گزری وہ گزرے گی ہر اہلِ درد پر
اور ہم دونوں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں
تیری پیشانی کی سج دھج، میری چاہت کا غرور
گو یہ وہ زندہ ہیں جو شرمندۂ قاتل نہیں
پھر بھی کس دامن دریدہ کو یہاں بخششِ ملی
اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں
اور ہم دونوں ہیں ان دیکھے دیاروں کے سفیر

مَیں اور تُو

روز جب دُھوپ پہاڑوں سے اُترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہوا بڑھتا ہوا بیکل سایہ
ایک دیوار سے کہتا، کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشّے میں سدا استادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی

کون دیوار ہمیشہ مگر استادہ رہی

وقت دیوار کا ساتھی ہے، نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ و گل و خشت کے ملبے کے تلے

اُسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ

دھوپ نکلی ہے، مگر جانے کہاں ہے سایہ
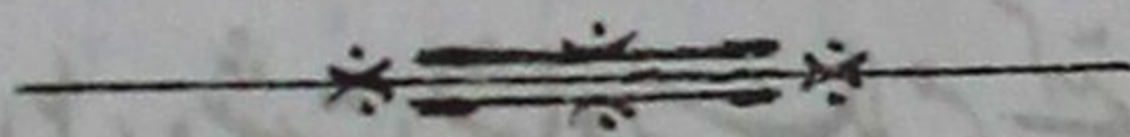
ایفریشیائی ادیبوں کے نام!

جہانِ لوح و قلم کے مسافرانِ جلیل

ہم اہلِ دشتِ پشاور سلام کہتے ہیں

دِلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے ہٹتا ہے

یہ حرفِ شوق بصد احترام کہتے ہیں

ہزار لفظ و بیان و زباں کا فرق سہی

مگر حدیثِ وفا ہم تمام کہتے ہیں

وہ ماؤ ہو کہ لوممبا، سکارنو ہو، کہ فیض
سبھی کے لوح و قلم عظمتِ بشر کے نقیب
سب ایک درد کے رشتے میں منسلک، بسمل
سبھی ہیں دور نظر سے، سبھی دلوں کے قریب
جکارتہ و سراندیپ سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ، سبھی کی ایک صلیب

ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے
ہم اہلِ شرق ہیں سورج تراشنے والے
مگر ہماری زمیں نور کو ترستی ہے
یہ کیا، کہ جو بھی گھٹا دشت سے ہمارے اٹھے
وہ دور پار سمندر پہ جا برستی ہے

زمیں پہ اب نہیں اترے گا کوئی پیغمبر
جہانِ آدمؑ و حواؑ سنوارنے کے لئے

یہاں محمدؐ و گوتمؑ، مسیحؑ و کنفیوشس
جلا چکے ہیں بہت آگہی فروز دیے
مگر ہے آج بھی اپنا نصیب تاریکی
مگر ہے آج بھی مشرق شبِ دراز لیے

ہمیں کو توڑنے ہوں گے صنم قدامت کے
ہمیں کو اب نیا انسان ڈھالنا ہو گا
ہمیں کو اپنے قلم کی ستارہ سازی سے
ہر ایک خطۂ تیرہ اُجالنا ہو گا
ہمیں کو امن کے گیتوں سے، میٹھے بولوں سے
مہیب جنگ کی آندھی کو ٹالنا ہو گا